مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

ایک مضمون نگار کی شکایت احباب سے

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

ایک دن میں دلّی کے چاندنی چوک میں سے گذر رہا تھا۔ کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی۔ جو بڑے موثر طریقے سے اپنی حالت زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا۔ وہ تین منٹ کے وقفہ کے بعد یہ درد سے بھری اسپیچ انہیں الفاظ اور اسی پیرایہ میں دوہرا دی جاتی تھی۔ یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوا۔ کہ میں اس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سننے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا، جسم خوب موٹا تازہ تھا۔ اور چہرہ ایک حد تک خوبصورت ہوتا۔ مگر بدمعاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی۔ یہ تو اس کی شکل تھی۔ رہی اس کی صدا تو میں ایسا قسی القلب نہیں ہوں۔ کہ صرف اس کا مختصر سا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ اس قابل ہے۔ کہ لفظ بلفظ لکھی جائے چنانچہ وہ اسپیچ یا صدا جو کچھ کہیئے۔ یہ تھی۔

اے بھائی مسلمانو! خدا کے لئے مجھ بدنصیب کا حال سنو۔ میں آفت کا مارا سات بچوں کا باپ ہوں۔ اور اب روٹیوں کو محتاج ہوں۔ اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں۔ مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانوں! میں غریب الوطن ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں۔ ہائے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خدا کے بندو! میری سنو۔ میں غریب الوطن ہوں۔"

فقیر تو یہ کہتا ہوا اور جن پر اس قصے کا اثر ہوا۔ ان کی خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے۔ اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اس سے کیا۔ اور مجھے خود تعجب ہوا۔ کہ اکثر امور میں میں نے اپنے سے اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ میں کام کرتا ہوں۔ اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے۔ نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے۔ وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں۔ وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ بس یہاں تک میں اس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کر اس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھی ہے۔ اس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہیئے۔ میں رات دن فکر میں گزارتا ہوں۔ اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے۔ کہ باوجود نسبورتے اور مصنوعی صورت بنانیکے اس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک

غور کرتا رہا۔ کہ اس کی یہ قابل رشک حالت کس وجہ سے ہے؟ اور آخر کار میں اس بظاہر عجیب نتیجے پر پہنچا۔ کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے۔ وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے۔ کہ "میرا کوئی دوست نہیں ہے" میں حسرت سے کہتا ہوں "میرے اتنے دوست ہیں"۔ اس کا کوئی دوست نہیں؟ اگر یہ سچ ہے۔ تو اسے مبارک باد دینی چاہیئے۔

میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا مکان پر آیا۔ کیسا خوش قسمت آدمی ہے، کہتا ہے۔ میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خوش نصیب شخص! نہیں تو تجھ سے بڑھ گیا۔ لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی ہے۔

یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں۔ جو میرے دوستوں کی طرح اسے دن میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں۔ مگر خبر نہیں، کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے گا۔ کہ میں تخلیے میں اپنے خیالات جمع کر سکوں۔ اور انہیں اطمینان سے قلمبند کر سکوں۔ یا جو اپیچ مجھے حل دینی ہے۔ اسے سوچ سکوں۔ کیا یہ فقیر دن دہاڑے اپنا روپیہ لے جا سکتا ہے۔ اور اس کا کوئی دوست راستہ میں نہ ملے گا۔ اور یہ نہ کہے گا:۔

"بھائی جان! دیکھیے پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں مجھے

اس وقت ضرورت ہے تھوڑا سا روپیہ قرض دو"۔ کیا اس کے دتحت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے۔ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اسے نیند کے جھونکے آ رہے ہوں۔ مگر یار دوستوں کا مجمع ہے۔ جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں۔ اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے دوستوں کے خطوط کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں۔ جو اسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا انہی احباب کی وجہ سے شور مچتا اور ہو حق نہیں کرنا پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں اسے ملاقات کو اسے جانا نہیں پڑتا؟ اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا۔ اگر ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے۔ تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہٹا کٹا ہے اور میں نحیف و نزار ہوں۔ یا اللہ۔ کیا اس پر بھی وہ شکر ادا نہیں کرتا۔ خدا جانے۔ وہ اب کون سی نعمت چاہتا ہے؟ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بیہودہ خیالات ہیں۔ بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ اور یہ ان سے بھاگتا ہے۔ مگر میں ان کو برا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں۔ کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے پاس آتے ہیں۔ اور میرے خیر طلب ہیں۔ مگر عملی نتیجہ یہ ہے۔ کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے۔ مجھے فائدہ پہنچانے کا اور ہو جاتا ہے۔ مجھے نقصان، چاہے جو پر افتر بن کی

جائے۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ ثابت نہ کر سکا۔ کہ احباب کا ایک جمِ غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے میں کیا فائدہ ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں۔ کہ اگر دنیا میں کچھ کام کرنا ہے۔ اور باتوں ہی میں عمر نہیں گزارنی ہے۔ تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ چاہے اس سے میرے دل پر کیسا ہی صدمہ ہو۔

مثلاً میرے دوست احمد مرزا ہیں جنہیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہوں۔ یہ نہایت معقول آدمی ہیں۔ اور میری ان کی دوستی نہایت پرانی اور بے تکلفی کی ہے۔ مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے۔ کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے۔ شور مچاتے ہوئے چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے ہیں۔ غرض کہ ان کا آنا بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں۔

"کوئی آرہا ہے۔ قیامت نہیں ہے"۔ ان کے آنے کی مجھے دور سے خبر ہو جاتی ہے۔ باوجودیکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ "میاں! اس وقت کام میں بہت زیادہ مشغول ہیں"۔ تو وہ فوراً چیخنا شروع کر دیتے ہیں۔ کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں۔ (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) "خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے؟

توبہ توبہ! اچھا بس میں ایک منٹ ان کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہوں گے نا؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اوپر آتے ہیں۔ اور دروازہ اس زور سے کھولتے ہیں۔ کہ گویا کوئی گولہ آکے لگا۔ آج تک انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں۔ اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں:۔

آہا ہا ہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا۔ مگر دیکھو، دیکھو۔ میری وجہ سے اپنا لکھنا بند مت کرو۔ میں حرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے؟ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ! مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے۔ کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے۔ جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو اب جاتا ہوں۔ میں بیٹھوں گا۔ نہیں ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا۔ تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی، خدا حافظ"

یہ کہہ کے وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں۔ اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں۔ کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا۔ اپنے ساتھ میرے کل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر اب وہ کہاں؟ اور دیکھا جائے۔ تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے۔ تاہم وہ اگر گھنٹوں رہتے۔ تو اس سے

زیادہ نقصان نہ کرتے۔ کیا میں انہیں چھوڑ سکتا ہوں؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ کہ میری اور ان کی دوستی بہت پرانی ہے۔ اور مجھ سے بھائیوں کی سی محبت کرتے ہیں۔ تاہم میں انہیں چھوڑ دوں گا۔ چھوڑ دوں گا۔ اگرچہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑے۔

اور لیجئے! دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب ہیں۔ اور رات دن انہیں کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں۔ تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں جب میں کام سے فارغ ہو چکتا ہوں۔ لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں۔ کہ دل یہی چاہتا ہے۔ کہ ایک گھنٹہ آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں مگر تحسین آئے ہیں۔ ان سے ملنا ضروری ہے۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لئے سوائے اپنے بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش کروں۔ مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں۔ تو وہ کہتے ہیں۔ ہاں! بڑا خراب موسم ہے۔ میرے چھوٹے بچے کو بخار آگیا۔ منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے۔ اگر پالی ٹیکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو شروع کرتا ہوں۔ تو تحسین فوراً معذرت پیش کرتے ہیں۔ کہ بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں۔ کہ اخبار پڑھوں۔ اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں۔ تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لئے ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے

رہتے ہیں کہ طبیعت تو نہیں گھبرائی؟ پیاس تو نہیں معلوم ہوتی؟ کبھی کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں۔ اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں۔ تو گھر کی بیماری ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں جنہیں اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے مخالف کی برائیوں، اور جج صاحب کی تعریف یا مذمت کے سوا دتعریف اس حالت میں جب کہ انہوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔ من جملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے۔ میں محمد شاکر خاں صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا۔ کیونکہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں۔ شاکر خاں صاحب سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت معزز آدمی ہیں۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ ان کا خیال ہے کہ اہل علم کی تھوڑی سی قدر کرنا، امرا کے شایان شان ہے۔ ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے۔ اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے۔ یہ کہہ کے:۔

"شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیل آب و ہوا بھی ہوگی۔ اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔ میں نے ایک کمرہ

خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن رہ کے چلے آنا۔ دیکھو! میری خوشی کرو۔"

میں ایسے محبت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا؟ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ "ایڈیٹر معارف سے وعدہ کر چکا تھا۔ کہ ایک خاص عرصہ میں ان کی خدمت میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا۔ جو میرے لئے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل میں تھا اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ اس کی کھڑکی پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی۔ اور ایک نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو میں نیچے ناشتہ کی غرض سے بلایا گیا۔ جب دوسرا پیالہ چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے کو چلنے کے لئے اٹھا ہی تھا۔ کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ۔ نہیں نہیں۔ کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی سے کام شروع کر دو۔ اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو۔ اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے۔ کہ سینری کا لطف اٹھانے میں گذارا جائے چلئے، گاڑی تیار کرلتے ہیں۔ دریا پہ مچھلی کا شکار کھیلیں گے پھر وہاں سے دو میل پر احمد نگر ہے۔ آپ کو وہاں کے رئیس راجہ طالب علی صاحب سے ملائیں گے۔"

میرا ماتھا وہیں ٹھنکا۔ کہ اگر یہی حال رہا تو یہاں بھی فرصت معلوم! آخیر سینکڑوں حیلے حوالوں سے اس وقت تو میں بچ گیا۔ اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے ٹھنگئے۔ مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جس عنقا یعنی یکسوئی کی تلاش میں میں سرگرداں تھا۔ وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

میں جلد سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا۔ اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا۔ جو میرے لکھنے پڑھنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کامدار کپڑا پڑا ہوا تھا۔ جس پر ایک قطرہ گرانا گناہ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات مگر سیاہی دیکھتا ہوں۔ تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب مگر اکثر میں نب ندارد۔ جاذب کاغذ ایک مخمل جلد کی کتاب میں مگر لکھنے کے کاغذ کا پتہ نہیں۔ اسی طرح بہت سا اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا۔ مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں۔ اور جو چیزیں کہ ضرورت کی تھیں وہ موجود نہیں۔ آخر کار میں نے وہی اپنا پرانا استعمالی مگر مفید بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم۔ جس نے اب تک نہایت ایمانداری سے میری مدد کی تھی۔ اور میرے پران خیالات کو بڑی کمے ساتھ قفس کاغذ میں بند کیا تھا۔ نکالا۔ اور لکھنا شروع کیا۔

یہ ضروری ہے۔ کہ جن مرغان خوشنوا کی تعریف میں تمہید اس

قدر رطب اللسان ہیں۔ ان کی اس عنایت سے میں خوش نہیں ہوا۔ کہ سب کے سب میرے کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا۔ تاہم میں نے کوشش کر کے ان کی طرف سے کان بند کر لئے۔ اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا ۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ تن تن، تنتنا نا چھن، تا تا تن تن تن، تن، میں ایسا مصروف تھا۔ کہ دنیا اور مافیہا کی خبر نہ تھی۔ یکایک اس تن تن نے چونکا دیا۔ یہ کیا ہے؟ اخوہ! اب میں سمجھا۔ میرے کمرے کے قریب شاکر خاں صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے! انہیں موسیقی میں بہت دخل ہے۔ اس وقت ستار سے شوق فرما رہے ہیں۔ بہت خوب بجا رہے ہیں۔

"وہ اس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہتِ زلف لائے کیوں؟"
"مجھ کو صبا سے ہے امید ہاں مجھ کو صبا سے ہے امید"
مجھ سے صبا کو کیا غرض"

واہ سبحان اللہ۔ کیا غزل چھیڑی ہے۔

" اے ترک سوار تو راج عرب، یثرب نگری پہنچا دینا
کس رنگ میں ہے وہ حبیب مرا، مجھے واں کی کھبریا لا دینا
بہت ہی خوب! کمال کرتے ہیں۔

کوئی ادھ گھنٹہ انہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے۔ اور خاموشی طاری ہو گئی۔ تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا۔

"اے میرے خیالات تمہیں میرا گنجینہ و میرا خزانہ ہو، خدا کے لئے رحم کرو۔ میرے دماغ میں پھر آ جاؤ۔" یہ کہہ کے میں کاغذ کی طرف متوجہ ہوا۔ کہ دیکھوں، کہاں چھوڑا ہے۔ میں اس فقرے تک پہنچا تھا۔

"ہم اس وسیع اور رقیق مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں۔ اتنا ہی اس کی مشکلات کا مثل . . . "

مثل کے آگے میں کیا لکھنے والا تھا؟ رنگ دریا کے اندازہ نہیں کر سکتے؟ ہرگز نہیں۔ ایسا معمولی فقرہ تو نہ تھا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ کچھ اور تھا۔ کوئی اعلیٰ درجے کی تشبیہ تھی۔ اور فقرے کو نہایت شاندار الفاظ میں ختم کرنے والا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے۔ کہ کیا تھا۔ کیا نہ تھا۔ اب تو دماغ میں اس کا پتہ بھی نہیں۔ گانے والے صاحب تو شکایت کر رہے تھے۔ کہ

اس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہت زلف لائے کیوں؟
مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض
مگر میرا تو صبا کے نام نے دماغ خالی کر دیا۔ اگر وہ آتی، اور

نکہت زلف بھی لاتی۔ تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ بہرحال اب مجھے وہ فقرہ از سر نو درست کرنا چاہیئے۔ مشکلات کی بجائے کچھ اور ہونا چاہیئے۔

"ہم اس وسیع میدان پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں۔ اتنا ہی ان بیش بہا علمی جواہر کو جو ہمارے ملک اور قوم کے علمی خزانے کو پُر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اور جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے؟"

"جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے رتنے دنوں کہاں رہے؟" یہ کیا مہمل فقرہ ہوا! لاحول ولاقوۃ۔ میں بھی کیا گڑبڑ کر رہا ہوں۔

"آپ کہاں بھول پڑے، اتنے دنوں کہاں رہے۔ یہ فقرے تو شاکر خاں صاحب نے کسی دوست سے کہے ہیں۔ جو ابھی اسے ملنے آئے ہیں۔ میں مصروفیت میں انہیں ہی لکھ گیا۔

ہاں تو کاٹ کے فقرہ درست کرنا چاہیئے۔ "اور جن کی قدر ابھی تک ملک و قوم کو معلوم نہیں ہوئی ہے۔ اور بطاہر۔۔۔۔

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں شبّن! سرکار نے کہا ہے۔ کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو۔ تو نیچے ذرا سی دیر کے لئے تشریف لائیے۔ کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ اور سرکار انہیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں۔"

بادلِ ناخواستہ میں اٹھا۔ اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست راجہ طالب علی صاحب تشریف لائے۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے۔ اور مجھے بھی فرصت ملی اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شبن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤں گا۔ گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کے دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پاکر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے۔ فقرہ از سرِ نو بنانا پڑا۔ طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ بہزار دقت بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی دفعہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ اور میں لکھ رہا تھا۔

"ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کے قابل نوجوان جنہیں تفتیش اور تحقیقات کا پورا شوق ہے۔ اور جو کولمبس کی طرح نئی معلومات اور نئی دنیا دگو وہ علمی دنیا ہی کیوں نہ ہو، کے دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں . . . . . ."

دروازہ پر پھر دستک۔

"کیا ہے؟"

"اچھا"

"دریافت کرنے کے لئے آپ کے تئیں خطرے میں ڈالنے سے بھی خوف نہیں کھاتے۔ ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے۔ اور اپنی کاوشوں اور کوششوں سے موجودہ۔۔۔۔۔"

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

"ہاں"

"حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے"۔

"اوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا۔ میرا انتظار نہ کریں۔ میں پھر کھالوں گا۔ اس وقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں"

"اور آئندہ نسلوں کا زیر بار احسان کریں گے۔ یہی نوجوان ہیں۔ جو قوم کی کشتی کو، خدا کی مدد پر بھروسہ کر کے خطرات سے بچاتے اور ساحل مراد تک پہنچاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ

دستک

"کیا ہے؟"

"سرکار کہتے ہیں۔ اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائیں گے تو ہم بھی اسی وقت کھائیں گے۔ مگر کھانا ٹھنڈا ہو کے بالکل خراب ہو جائے گا"

"اچھا بھائی۔ لو ابھی آیا"

یہ کہہ کے میں کھانے کے لئے جاتا ہوں۔ سب سے معذرت کرتا ہوں میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں۔ چہرے پر تھکن معلوم ہوتی ہے۔ کیا بہت لکھ ڈالا۔ دیکھو میں تم سے کہتا تھا نا! کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں؟

سوائے اس کے کہ میں آمنا و صدقنا کہوں۔ اور کیا کہہ سکتا تھا؟ اب کھانے پر اصرار ہوتا ہے جس چیز سے مجھے رغبت نہیں۔ وہی کھلائی جاتی ہے۔ بعد کھانے کے میزبان صاحب فرماتے ہیں "سہ پہر کو تمہیں گاڑی میں چلنا ہوگا۔ میں تمہیں اس واسطے یہاں نہیں لایا کہ سخت دماغی کام کر کے اپنی صحت خراب کر لو۔"

واپس کمرے میں آکر میں تھوڑی دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کر لوں۔ اور پھر لکھنا شروع کر دوں۔ مگر اب کہاں؟ مضمون اٹھا کر دیکھتا ہوں "زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ" اس کے متعلق کیا لکھنے والا تھا؟ ان الفاظ کے بعد کون سے الفاظ دماغ میں تھے؟ اب کچھ خیال نہیں۔ کہ اس کو پہلے فقروں میں کیونکر ربط پیدا کرنا تھا۔ یوں ہی پڑتے پڑتے نیند آجاتی ہے۔ تیسرے پہر اٹھتا ہوں۔ تو دماغ بہت صحیح پاتا ہوں "زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ" بالکل حل ہو جاتا ہے۔ پورا فقرہ آئینہ کی طرح صاف نظر آتا ہے۔ میں خوشی خوشی اٹھ کر میز پر گیا اور لکھنا چاہتا تھا۔ کہ پھر وہی دستک!

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے، سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں فوراً نیچے جاتا ہوں۔ تو پہلا فقرہ جو میزبان صاحب کہتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے "آج دستے کے دستے لکھ ڈالے"۔ میں سچی بات کہوں کہ "کچھ بھی نہیں لکھا"۔ وہ تو ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ "آخر اس قدر کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے؟" ؎

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھائیے قسمیں
مجھے یقین ہوا۔ مجھ کو اعتبار آیا

مل ملا کر شام کو واپس آئے کھانے کے بعد باتیں ہوتی ہیں۔ سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام دیکھتا ہوں۔ تو ایک صفحے سے زیادہ نہیں۔ وہ بھی بے ربط و بے سلسلہ۔ غصہ اور رنج میں اگر اسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔ اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے اپنے گھر واپس چلا آتا ہوں۔ میں ناشکرا اور احسان فراموش کہا جاؤں گا۔ مگر میں مجبور رہوں۔ اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دوں گا۔

میں نے ذرا تفصیل سے ان کا حال بیان کیا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ یہیں ان احباب کی فہرست ختم ہو گئی۔ جن سے میں رخصت طلب کر سکتا ہوں۔ نہیں ابھی بہت سے باقی ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ہیں۔ جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے۔ مگر جب آتے ہیں۔ میں ان کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لئے آتے ہیں۔ ایک

صاحب ہیں۔ جو ہمیشہ ایسے وقت میں آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں۔ جب مجھ سے ملتے ہیں کہتے ہیں۔ "میاں صاحب! عرصہ سے میرا دل چاہتا ہے تمہاری دعوت کروں"۔ مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست ہیں وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔ جب میں جواب دیتا ہوں۔ تو متوجہ ہو کر نہیں سنتے۔ یا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں۔ یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں۔ جو جب آتے ہیں۔ اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔ میری نہیں سنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں۔ مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں۔ صاف صاف کہتا ہوں۔ کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں: ؎

"مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"

اب چونکہ میں نے یہ حال لکھنا شروع کر دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور احباب کے متعلق اپنے دلی خیالات ظاہر کروں۔ دروازے پر ایک گاڑی آکر رکی ہے۔ میں سمجھ گیا۔ کہ کون صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کی شکایت نہیں کرنے کا۔ کیونکہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ کہ تین گھنٹے سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ کسی کرم فرما نے کرم نہیں فرمایا۔ اس لئے اس کے شکریہ میں میں اس مضمون کو اسی نا تمام حالت

میں چھوڑتا ہوں۔ اور اپنے دوست کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جب آتے ہیں۔ مجھ پر اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں۔ کہ تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔" میں جانتا ہوں کہ اس وقت بھی یہ کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائیں گے۔ جو بڑا حاذق ہے۔ یا کوئی نسخہ میرے لیے کسی سے مانگ کر لائے ہوں گے۔

"آیئے آیئے! مزاج عالی! بہت دن بعد تشریف لائے۔

(ملخص)